© rasailojaraid.com

علم کلام اور جدید مسلمان معاشرہ

ایک مذاکرہ

علمِ کلام کے باب میں اٹھنے والے اہم سوالات اسلامی نظریاتی کونسل کی ایک علمی نشست کا موضوع تھے جس میں ملک کے ممتاز اہلِ علم نے اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔ اس روداد میں اس گفتگو کا احاطہ کیا گیا ہے۔

مسلمانوں کا علم کلام اور اس سے جنم لینے والے سوالات اس مرتبہ اسلامی نظریاتی کونسل کی علمی مجلس کا موضوع تھے۔ ۲۷ / مارچ ۲۰۰۸ء کو منعقد ہونے والی اس مجلس میں ملک کے درج ذیل صاحبانِ علم شریک ہوئے:

۱۔ ڈاکٹر منظور احمد، ریکٹر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد و رکن اسلامی نظریاتی کونسل۔

۲۔ جناب جاوید احمد غامدی، صدر المورد فاؤنڈیشن برائے علم و تحقیق لاہور و رکن سالامی نظریاتی کونسل

۳۔ ڈاکٹر خالد علوی، سابق ڈائریکٹر جنرل دعوہ اکیڈمی، اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔

۴۔ پروفیسر فتح محمد ملک، صدر نشین مقتدرہ قومی زبان۔

۵۔ ڈاکٹر محسن مظفر نقوی، رکن اسلامی نظریاتی کونسل۔

۶۔ ڈاکٹر سید ناصر زیدی، ڈائریکٹر جنرل (ریسرچ)، اسلامی نظریاتی کونسل۔

۷۔ ڈاکٹر محمد خالد مسعود، چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل۔

۸ ۔ خورشید احمد ندیم' میزبان مجلس

مہمان مدیر ''اجتہاد' نے نظامت کی ذمہ داری ادا کی۔ انہوں نے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے ان سوالات کو نمایاں کیا، جن پر غور و فکر اس عہد کی بڑی علمی ضرورت بن چکی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر عہد ایک خاص علم کلام سے منسوب ہوتا ہے جس کے دائرے میں رہتے ہوئے ہر مذہب اور فکر اپنا مقدمہ پیش کرتا ہے۔ اہل اسلام نے آج کے علمی پس منظر میں اگر اپنی بات کہنی ہے تو انہیں اس موضوع کو غور و فکر کا موضوع بناتے ہوئے درج ذیل سوالات پر اپنا نقطہ نظر واضح کرنا ہوگا:

★ علم کلام کی تعریف کیا ہے اور علمی مکالمے میں اس کی کیا اہمیت ہے؟
★ مسلمانوں کے علم کلام کی روایت کیا ہے اور اس نے کس تہذیبی و علمی پس منظر میں جنم لیا؟
★ دور جدید میں درپیش مسائل کے پس منظر میں کیا مسلمانوں کے لیے نئے علم کلام کی ضرورت ہے؟
★ جدید علم کے حوالے سے مسلمان اہل علم کے خیالات کیا ہیں؟
★ برصغیر میں مسلمانوں کے علمِ کلام کی روایت کے اہم خدوخال کیا ہیں؟

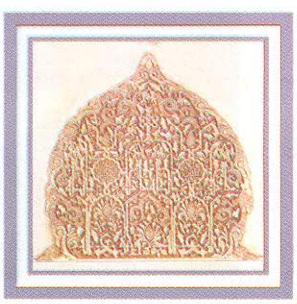

ڈاکٹر خالد مسعود نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ علم کلام اصلاً ابلاغ کا مسئلہ ہے۔ علماء کو ہمیشہ اس سوال کا سامنا رہا ہے کہ وہ دینی مسائل پر عامة الناس کے ساتھ کس طرح مکالمہ کریں اور دینی تعلیمات کو عام فہم انداز میں پیش کریں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب ''الحیلة الناجزة'' کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ جب یہ شائع ہوئی تو مصنف کی طرف سے یہ ہدایت دی گئی کہ اس کتاب کو عامی کسی محقق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی مدد سے پڑھیں۔ تاہم موجودہ دور میں علماء نے ابلاغ کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اس طرح کی کتابوں کی فرہنگ اور تسہیل وغیرہ کی اشاعت ہونے لگی ہے۔

ڈاکٹر خالد مسعود کا کہنا تھا کہ برصغیر میں جدید علم کلام کی اصطلاح سب سے پہلے سر سید احمد خان کے ہاں ملتی ہے۔ بدقسمتی سے سر سید کو ہمارے ہاں غلط سمجھا گیا۔ وہ جو بات اصلاً کہنا چاہتے تھے وہ پس منظر میں چلی گئی اور ضمنی و فروعی باتیں زیادہ زیر بحث آ گئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ علم کلام کی دو جہتیں یا سطحیں ہیں، ایک سطح کا تعلق عقائد کی تعریف اور ان کے دفاع سے ہے۔ اس طرح گویا ہمیں اسلام پر وارد ہونے والے اعتراضات کے جواب فراہم کرنے ہیں۔ ان کے نزدیک اس سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی ثقافت میں علم کلام وہ بنیادی علم ہے جو ایک فریم ورک، اصول یا مسلمات کا نام ہے، جن سے آپ تاریخ اور دوسرے میدانوں میں نتائج اخذ کرتے ہیں۔ سر سید کا کہنا یہ تھا کہ ہم کو اگر مغرب سے مکالمہ اور بات کرنی ہے تو یہ مسلمات یا اصول، دوسرے لفظوں میں قدیم کلام اس سلسلہ میں ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ پرانے مسلمات بھی انہی اصولوں کی بنیاد پر مرتب کیے گئے تھے جن پر اس دور میں بالعموم اتفاق پایا جاتا تھا۔ جدید دور میں چونکہ یہ مسلمات تبدیل ہو گئے ہیں اس لیے اب ہمیں ایک نئے علم کلام کی ضرورت ہے۔ سر سید کا اصل اصرار اس بات پر تھا۔ بدقسمتی سے معجزات اور فرشتوں یا جنوں کے بارے میں ان کے خیالات ہمارے ہاں زیادہ تر توجہ کے مستحق سمجھے گئے اور ان کا اصل پیغام پس منظر میں چلا گیا۔

ڈاکٹر خالد مسعود نے علامہ اقبال کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے سر سید کی بات کو آگے بڑھایا لیکن ان کے عہد تک پہنچتے پہنچتے حالات تبدیل ہو گئے تھے۔ اس وقت انگریزوں سے وفاداری وغیرہ زیادہ بڑے مسئلے نہیں تھے اور آزادی کا مسئلہ زیادہ شدت کے ساتھ زیر بحث تھا۔ ان کے ہاں مغربی تہذیب پر تنقید کو زیادہ اہمیت دی گئی جس سے علم کلام کا مسئلہ قدرے سیاسی ہو گیا اور اقبال کے ہاں اسلامی تہذیب کی دفاع کا پہلو غالب رہا۔ اس سے بجائے اس کہ کہ بحث کا رخ عالمی مسلمات کی طرف ہوتا، زیادہ تر یہ مسئلہ موضوع بحث بنا کہ مغرب ہم پر حملہ آور ہے اور ہمیں اپنا دفاع کرنا ہے۔ اس سے بحیثیت مجموعی ہمارا علم کلام متاثر ہوا اور سر سید کے کام کو آگے بڑھانے کے باوجود اقبال کی کوششیں سیاسی مسائل کا حل دینے پر مرتکز ہو گئیں۔

آج ایک مرتبہ پھر تناظر تبدیل ہو گیا ہے۔ عالمگیریت کے اس عہد میں مسلمات بدل گئے ہیں۔ اس لیے ہمیں ایک نئے علم کلام کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں میں انیسویں صدی کے آغاز سے اب تک اس موضوع پر بیس کے قریب اہم تصانیف سامنے آئی ہیں۔ آج جدید علم کلام پر بیروت، ایران اور ترکی وغیرہ میں زیادہ تر بات ہو رہی ہے۔ ترکی میں سیکولرزم کے خلاف جو چیزیں سامنے آئی ہیں اور جو فکری نظام دیا جا رہا ہے، اسے سر سید کے کام کے مترادف اور مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں مسائل پر گفتگو تو ہو رہی ہے لیکن اصوی بنیادوں کی فراہمی پر زیادہ توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ اور اگر اس ضمن میں کوئی کام ہوا بھی ہے تو وہ زیادہ قابل ذکر نہیں۔ ہمیں اس بات کو شعوری طور پر سمجھنا ہے کہ حالات میں کیا تبدیلی واقع ہو چکی ہے اور ہمیں آج کن دلائل کی ضرورت ہے۔ س کو موضوع بنائے بغیر آگے نہیں بڑھ سکے گی۔

ڈاکٹر خالد مسعود نے اس پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی کہ آج کے دور میں عوام کو شریک بحث کیے بغیر بات نتیجہ خیز نہیں ہو گی۔ آج یہ محض ماہرین کی گفتگو نہیں رہی۔ اگر انٹرنیٹ وغیرہ پر ان مسائل پر ہونے والی گفتگو کو ایک وسیع تر تناظر میں دیکھیں تو معروف معنوں میں کوئی ''ماہر'' رہا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ تھا کہ سوالات ابتدا میں اٹھا دیے گئے ہیں اور پس منظر میں نے بیان کر دیا ہے۔ اب اس تناظر میں بات آگے بڑھے گی تو اس موضوع کی مختلف جہتیں واضح تر ہوتی جائیں گی۔

کونسل کے ڈائریکٹر جنرل (ریسرچ) ڈاکٹر سید ناصر زیدی نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ دور جدید میں ایک نئے علم کلام کی ضرورت اس لیے ہے کہ انسانی معاشرے کو نئے مسائل، موضوعات اور شبہات کا سامنا ہے جن کی اس

ہر عهد ایک خاص علم کلام سے منسوب ہوتا ہے جس کے دائرے میں رہتے ہوئے ہر مذہب اور فکر اپنا مقدمه پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر محمد خالد مسعود

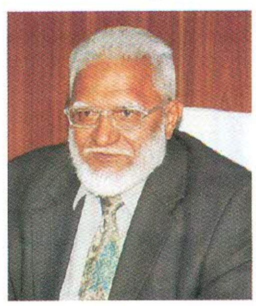

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے پہلے نظیر نہیں ملتی۔ ان موضوعات پر اظہار خیال کرنے اور جدید شبہات کا جواب دینے کے لیے متکلمین کی گذشتہ روش کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے درپیش چیلنجز، موضوعات اور شبہات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ان کی اصل بنیادیں کیا ہیں اور پھر ان علمی بنیادوں کی روشنی میں نئی روش اور نئے اصول اپنانے ہوں گے۔

ڈاکٹر سید ناصر زیدی نے کہا کہ نئے سوالات اور شبہات کی وجہ یہ ہے کہ آج کے انسان نے انسان اور کائنات کو ایک نئی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ زندگی کی مشکلات کو حل کرنے میں نئی ترقی نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہاں تک کہ آج کا انسان یہ دعویٰ کرتا ہوا نظر بھی آ رہا ہے کہ سائنس حتیٰ کہ ان چیزوں کو بھی حل کر سکتی ہے جن کا تعلق عقل وفکر اور معرفت سے ہے۔ اسی طرح سیاسی واجتماعی تبدیلیوں نے بھی انسانی حقوق، عدالت اجتماعی، آزادی، برابری اور مساوات کا ایک نیا تصور ہے۔ مغربی فلاسفہ نے بھی ایسے نظریات پیش کیے ہیں جن کی وجہ سے دین کی روایتی بنیادوں کو سخت دھچکا لگا ہے۔ انہی نظریات کی بنا پر دین کی تجربی حیثیت کو اہمیت دی جانے لگی ہے۔ دین کی عملی اور اجتماعی افادیت کو حقانیت کا اصل ومعیار قرار دیا جا رہا ہے۔ اس بات پر بھی گفتگو شروع ہو گئی کہ دین کی زبان کونسی ہے۔ حقیقی ہے، تمثیلی ہے، عرفی ہے یا علامتی۔ اسی طرح دین کے نفسیاتی رخ کو بھی اہمیت دی جا رہی ہے۔ بہرحال آج کے متکلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ مخاطبین وحی کے ذہنوں میں ہونے والی تبدیلی کو دیکھتے ہوئے اپنے لیے کلامی روش کا انتخاب کرے۔

ڈاکٹر سید ناصر زیدی نے کلام جدید کے تناظر میں مغرب میں پیغمبر اسلام کے توہین آمیز خاکوں پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے معقول روش اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں مغرب کو ان بنیادوں پر جواب دیا جائے یا اپنا احتجاج ریکارڈ کیا جائے جن بنیادوں کو خود مغرب سمجھتا ہے اور اسے قبول کرتا ہے۔ مغرب کو یہ بتانے کی ضرورت ہے جس آزادی اظہار کی تم بات کرتے ہو، جن انسانی حقوق کی آواز تم بلند کرتے ہو، اس قسم کا کام تمہارے متعارف کردہ اصولوں کے بھی خلاف ہے۔

ڈاکٹر سید ناصر زیدی نے کہا کہ مسلمانوں کو بھی احتجاج کا وہ انداز اپنانا ہے جو اسلام کا اچھا چہرہ پیش کرے۔ اگر احتجاج ایسی نوعیت کا ہو کہ جس کے تحت اپنی ہی املاک کو نقصان پہنچایا جائے اور اپنی قوم اور حکومت کو بدنام کیا جائے تو اس سے مغرب کے اس سیاسی گروہ کی اہداف پورے ہوں گے جو وہ اس قسم کی حرکتوں سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ علاوہ ازیں اس بات کو بھی مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ خود مغرب کے عوام کی اکثریت بھی مسلمانوں کے خلاف توہین آمیز رویے اور ان کی دل آزاری کی شدید مذمت کرتے ہیں۔

مجلس کے میزبان نے اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ علم کلام کے مسئلے کو دو پہلوؤں سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ ہمارے قدیم متکلمین نے بعض سوالات کو موضوع بنایا جیسے وجود باری تعالیٰ کے لیے دلائل کی فراہمی۔ کیا آج بھی فکر انسانی کو یہی سوالات درپیش ہیں؟ دوسرا یہ کہ جن امور کو ہم مسلمات فرض کرتے ہیں کیا وہ فی الواقع مسلمات ہیں؟ مثال کے طور پر آج ہم بعض امور کے ثبوت کے لیے تجرباتی شہادت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کیا ہمیں اسے ایک مسلمہ مان کر بات آگے بڑھانی ہوگی۔ اس طرح یہ بات بھی کہی گئی کہ مسلمان آخرت کے تناظر میں اپنا مقدمہ پیش کرتا ہے تو کیا یہ ابلاغ یا مکالمے کے لیے ایک بنیاد بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر خالد مسعود نے اس بات میں اضافہ کرتے ہوئے مغرب میں قرآن یا رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے واقعات کی طرف اشارہ کیا جن تک اب انٹرنیٹ، یوٹیوب کے باعث سب کی رسائی ہے۔ ان کا سوال یہ تھا کہ ان مسائل پر ہم اہل مغرب کو اپنی بات منوانے میں کیوں کامیاب نہیں ہو سکے؟ کیا یہ بھی علم کلام کا مسئلہ ہے؟

ڈاکٹر محسن نقوی نے مسلمات کے تعین کے مسئلہ کو زیر بحث لاتے ہوئے بحث کو آگے بڑھایا اور یہ سوال اٹھایا کہ جو مذہبی

سرسید کو ہمارے ہاں غلط سمجھا گیا۔ وہ جو بات اصلاً کہنا چاہتے تھے وہ پس منظر میں چلی گئی اور ضمنی وفروعی باتیں زیاہ زیر بحث آگئیں۔

ڈاکٹر سید ناصر زیدی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈاکٹر محسن نقوی

مسلمات علم کلام میں زیر بحث آتے ہیں، کیا ان پر بھی ایک علمی نظام فکر کے تحت گفتگو کی جانی چاہیے؟ ان کا کہنا تھا کہ مذہبی علم کلام، مذہب ہی کا ایک جزو ہوتا ہے اور اس کے اندر سے جنم لیتا ہے۔ مذہب سے متعلق امور کو دلیل کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔ یعنی مذہب خود ہی دلیل ہوتا ہے۔ جب ہم مسلمات کی بات کرتے ہیں تو پھر بحث مذہب کے پیراڈائم سے نکل جاتی ہے۔ مثلاً ہم خدا کو اس طرح مانتے ہیں جیسے سورہ اخلاص میں اس کا ذکر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ عقلی بحث سے نکل کر ایمانیات کے دائرے میں داخل ہو گیا ہے۔ گویا ایمان پہلے اور عقل بعد میں۔ ہر مذہب، یہودیت، عیسائیت اور مسلم علم کلام میں آیات سے استدلال ہوتا ہے اور اس پر پھر عقلی دلائل دیے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ خود ایک مذہب کے دائرے میں ہونے والی فرقہ وارانہ بحثوں میں بھی اختیار کیا جاتا ہے جیسے ہمارے ہاں جبریہ اور قدریہ وغیرہ کی بحث ہے۔

ڈاکٹر محسن نقوی کا کہنا تھا کہ ہمارے ہاں اس نے ایک مربوط نظام فکر کی صورت اس وقت اختیار کی جب یونانی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ یعنی مسلمات وضع کرنا، استخراجی منطق وغیرہ کا استعمال یا پھر کلیات اور مسلمات وغیرہ کا تعین اس عہد میں ہوا۔ اس طرح جنہیں ہم مذہبی مسلمات قرار دیتے ہیں جیسے اللہ پر ایمان، فرشتوں اور کتابوں وغیرہ پر ایمان، ان پر جو یہودی علم کلام وجود میں یا جسے بعد عیسائیوں نے اپنایا، وہی روایت مسلمانوں میں بھی آگے بڑھی۔ جو فرق واقع ہوا وہ استدلال کے ماخذ کا تھا۔ یعنی یہودیوں نے بطور ثبوت تورات کی آیات پیش کیں اور مسلمانوں نے قرآن مجید کی۔

مغرب میں آنے والی تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر محسن نقوی نے بتایا کہ جب وہاں سائنسی انقلاب آیا اور اس کے نتیجے میں حیاتیاتی ارتقا یا کائناتی ارتقا کے تصورات کو قبول کیا گیا تو سب سے پہلے مذہب کو مسترد کیا گیا۔ جب کتاب پیدائش اور الہامی کتب کے بنیادی مقدمات جیسے زمین کا ساکن ہونا وغیرہ چیلنج ہوئے تو یہودیوں اور عیسائیوں نے سوچا کہ اب بنیادی مذہبی استدلال کو تبدیل کر دینا چاہیے۔ چنانچہ منظّم نظام فکر پر اصرار ہوا۔ لبریشن تھیالوجی وغیرہ کے تصورات یہودیت اور عیسائیت کے پس منظر میں سامنے آئے اور استدلال کی بنیادوں کو تبدیل کیا گیا۔ اب ہمارے ہاں عیسائیوں یا دیگر ادیان پر جو کام ہوا اس میں زیادہ زور ان کی تردید پر رہا اور اس ضمن میں پیش گوئیوں پر مبنی روایات زیر بحث رہیں۔ لیکن ان کے فکری سرمایے سے استفادہ نہیں کیا گیا۔ عیسائیوں وغیرہ نے اپنا پیراڈائم تبدیل کر لیا مگر اس دوران میں مسلمانوں میں یہ روایت آگے نہیں بڑھی۔ مثال کے طور پر ہمارے ہاں اب بھی ان مسائل پر گفتگو ہوتی ہے کہ رسالت مآب ﷺ جب معراج پر تشریف لے گئے تو آسمان کیسے پھٹا۔ جب واپس تشریف لائے تو پھر سلا کیسے یا یہ کہ جب حضرت جبریلؑ نے آسمان پر دستک دی تو پوچھا گیا کہ کون ہے، بلائے گئے ہیں یا خود آئے ہیں اور اس کے بعد دروازہ کھولا گیا۔ ہمارے ہاں یہ سوالات جدید سائنسی طریق سے زیر بحث نہیں آ رہے۔ اسی بنیاد پر ڈاکٹر محسن نقوی کی رائے تھی کہ جب تک استدلال کا پیراڈائم تبدیل نہیں ہو گا، بات آگے نہیں بڑھ پائے گی لہٰذا ہمیں بھی عیسائیوں کی طرح ایک نئی منظّم الٰہیات کی ضرورت ہے۔

> اسلامی ثقافت میں علم کلام وہ بنیادی علم ہے جو ایک فریم ورک، اصول یا مسلمات کا نام ہے، جن سے آپ تاریخ اور دوسرے میدانوں میں نتائج اخذ کرتے ہیں۔

پروفیسر فتح محمد ملک نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ قرن اول کے مسلمانوں نے اپنے آپ کو وقف کرتے ہوئے اپنے زمانے کے علوم میں مہارت حاصل کی اور ان کی مدد سے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ کلام الٰہی کی حکمت کیا ہے؟ علوم کی ترقی کے ساتھ ہمارے ہاں المیہ یہ ہوا کہ تنزل کو ترقی سمجھ لیا گیا۔ علم کلام خاص علماء کا شعبہ بن گیا۔ جن لوگوں کو علوم پر دسترس تھی وہی حاکم بن گئے اور ان کی حدود میں ساری بحث سمٹ آئی۔

سرسید اور علامہ اقبال نے خود کو متکلم نہیں کہا۔ انہوں نے بھی معاصر علوم میں مہارت پیدا کی اور حکمت قرآن کو بیان کر دیا۔ یہی ان کا علم کلام تھا۔ ہم آج سرسید یا علامہ اقبال کے بجائے علما کو مذہب پر سند مانتے ہیں۔ یہ خود بھی ایسا دعویٰ نہیں کرتے نہ دیگر لوگ یہ کہتے ہیں جو جدید علوم کی تحصیل کے بعد قرآن میں غوطہ زن ہوئے۔ وہ بھی خود کو متکلم نہیں کہتے۔ سرسید جب علماء کی تنقید

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پروفیسر فتح محمد ملک

کی زد میں آئے تو انہوں نے علم کلام کی بات کی اور اپنی تنقید بیان کی۔ اقبال اس سلسلے کے آخری آدمی ہیں جنہوں نے قرآن مجید کو سمجھا اور پھر اپنے عہد کو قرآن کی روشنی میں بدلنے کی کوشش کی۔ بدقسمتی سے علماء نے اس پر توجہ نہیں دی۔ مثلاً خطبات میں جنت دوزخ اور برزخ وغیرہ کا انہوں نے جو مفہوم بیان کیا ہے اس کو کفر کے مترادف سمجھا گیا۔ خطبات میں اجتہاد پر ان کا خطبہ اس بات پر ختم ہوا کہ قرآن کا پیغام ماضی میں جزوی طور پر منکشف ہو سکا کیونکہ انسان ترقی یافتہ نہیں تھا۔ اب نئے علوم کی تحصیل کے بعد کلی صداقت تک پہنچنا ممکن ہو گیا ہے۔ جو لوگ اس میدان میں سامنے آئیں گے وہی اس فہم کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر صاحب کا کہنا تھا کہ ختم نبوت کے عقیدے کے سبب مسلمانوں کو سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہونا چاہیے تھا، یعنی اپنی عقل سے کام لینا چاہیے تھا۔ ہمیں تاریخ سے نکل کر حال اور مستقبل کی طرف مراجعت کرنی چاہیے۔ اقبال اور سرسید اسی کا پیغام دیتے ہیں لیکن ہم انہیں درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ آج جنت دوزخ برزخ وغیرہ کی بحث ممکن ہے ایک نازک معاملہ قرار پائے لیکن ہمیں یہ تو دیکھنا چاہیے کہ اقبال کا علم کلام جاگیرداری کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ الارضُ لِلّٰہ کے بارے میں اقبال کیا کہتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جو اس کا باطنی پیغام نہیں سمجھا وہ دین کی حقیقت سے بے خبر رہا۔

ہمارے ہاں جب جاگیرداری کا مسئلہ شرعی عدالت کے سامنے آیا تو زرعی اصلاحات کو حرام قرار دے دیا گیا۔ یہ سیاسی اور عملی مسائل ہیں جن پر آج جرأت کے ساتھ بات کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ہمیں ہر عالم کو پڑھنا چاہیے لیکن کسی ایک کو سند کا درجہ نہیں دینا چاہیے۔ آج کے دور میں صحیح معنوں میں کوئی مفتی نہیں کیونکہ وہ ابھی تک پرانے دور میں الجھے ہوئے ہیں۔

پروفیسر صاحب کا خیال تھا کہ اقبال کو بھی ہم نے خانوں میں بانٹنے کی کوشش کی۔ ضیاء الحق صاحب کے دور میں باقاعدہ مہم چلی کہ ایک رات کا اقبال ہے اور ایک دن کا اور ہمیں رات والا اقبال قبول ہے۔ آج تک ہم اس کا فیصلہ نہیں کر سکے۔ پروفیسر فتح محمد ملک کی رائے یہ تھی کہ ہمیں اسلام کو علما کی قید سے رہا کرانا ہوگا۔ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس کا یہ مفہوم یہ نہیں کہ علما شریک بحث نہ ہو، یقیناً ان سے کسب فیض کیا جائے گا لیکن آج ایک مزارع کا بھی حق ہے کہ وہ دین کو سمجھے اور یہ سوال اٹھائے کہ کلام اللہ میں کیا میری نجات کی بھی کوئی صورت بیان کی گئی ہے یا نہیں؟ اقبال نے تاریخ کے ایک دور میں اپنی بات کہہ دی۔ اب ہمیں آگے بڑھنا ہوگا اور نئے علوم کی روشنی میں قرآن کی صداقت تک پہنچنا ہوگا۔ نئے علوم میں بھی تبدیلی آئی ہے لیکن آج یہ جس منزل پر ہیں، ان کی تحصیل ضروری ہے۔ علوم میں دینی اور غیر دینی کی تقسیم بے معنی ہے۔ تمام علوم دینی ہیں۔ انسان کا بنیادی سوال یہ ہے کہ اس کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے قرآن ہماری کیا مدد کرتا ہے۔ یہ مسئلہ اہم نہیں کہ قرآن خالق ہے یا مخلوق؟ اہم یہ ہے کہ قرآن کا پیغام کیا ہے، وہ کہتا کیا ہے؟ آج بحث یہ ہونی چاہیے کہ اقبال اور سرسید کیا کہتے ہیں نہ کہ وہ متکلم تھے یا نہیں۔ جنت دوزخ وغیرہ پر ان کے خیالات غلط ہو سکتے ہیں لیکن انہیں زیر بحث آنا چاہیے۔ اقبال نے اپنے خطبے میں مسلمانوں کی نئی نسل سے اس امید کا اظہار کیا ہے کہ وہ قرآن کے مکمل مفہوم کی طرف بڑھے گی۔ ختم نبوت کے عقیدے کے بعد مسلمانوں کو دنیا میں The most liberated قوم ہونا چاہیے۔

مغرب کو یہ بتانے کی ضرورت ہے جس آزادی اظہار کی تم بات کرتے ہو، جن انسانی حقوق کی آواز تم بلند کرتے ہو، اس قسم کا کام تمہارے متعارف کردہ اصولوں کے بھی خلاف ہے۔

زیر بحث مسئلہ کو مزید واضح کرنے کے لیے میزبان مجلس نے یہ نکتہ اٹھایا کہ ہمارے ہاں ایک رائے یہ ہے کہ درپیش فکری مسائل میں ہمیں ایک نئے نظام فکر کی تشکیل کی ضرورت ہے جسے ڈاکٹر منظور احمد پیراڈائم شفٹ کہتے ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ قدیم پیراڈائم میں رہتے ہوئے جدید مسائل کے حل کے لیے، ہمیں بنیادی ماخذ کی تفہیم نو کرنا ہوگی جیسے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ''قرآن کی چار بنیادی اصلاحیں'' میں اس کی ایک کوشش کی ہے۔ علم کلام کی بحث میں یہ سوال بھی زیر بحث آنا چاہیے کہ یہ کوششیں درپیش مسائل کے جواب کے لیے کتنی کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈاکٹر خالد علوی نے اپنی گفتگو کا آغاز علم کلام کی تعریف اور اس کے تاریخی پس منظر کے بیان سے کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ علم کلام بنیادی طور پر مسلمانوں کے عقیدے کے دفاع کے لیے وجود میں آیا جب ان کا سامنا عیسائیوں اور مجوسیوں وغیرہ سے ہوا، جن کے پاس ایک ترقی یافتہ نظام فکر موجود تھا۔ جیسے خدائے خیر وشر، تثلیث اور مسیحؑ کے کلمۃ اللہ کے بارے میں دلائل موجود تھے۔ اس طرح قرآن کے کلام اللہ ہونے کے سوال سے بھی اس بحث کا آغاز ہوا۔ متکلمین ان لوگوں کا گروہ تھا جو عقلی دلائل سے دین کے مسلمات کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس دفاع میں مسلمانوں کے اہل دانش کا جو طبقہ اس بحث میں الجھا، بعد میں خود اس کے اندر مختلف آراء پیدا ہوئیں اور ان مسائل کو جن کے حل کے لیے عقل کو استعمال کیا جاتا تھا، جیسے توحید، کئی نقطہ ہائے نظر وجود میں آئے۔ اس کے نتیجے میں خود عقل کی حیثیت زیر بحث آئی۔ چنانچہ اشاعرہ اور معتزلہ میں ہمیں یہ بحث ملتی ہے کہ اشیا کا حسن وقبح حقیقی ہے یا وحی پر مبنی۔ اس بحث میں بنیادی ہتھیار کی حیثیت ارسطو کی منطق کو حاصل تھی۔ یہ بحث ابن تیمیہ تک اسی طرح جاری رہی۔ انہوں نے آ کر اس پیراڈائم ہی کو تباہ کر دیا۔ انہوں نے اس مقدمے ہی کو چیلنج کر دیا کہ عقلی استدلال ہی کسی امر کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہی طریقہ استدلال درست ہے جو قرآن بیان کرتا ہے یا جسے پیغمبر علیہ السلام نے پیش کیا ہے۔ یوں علم کلام کا ایک سلفی اسلوب سامنے آیا جو قدیم علم کلام کا ردعمل تھا۔ اس وقت جن مسلمات کے دفاع کے لیے علم کلام وجود میں آیا ان میں نبوت کا ادارہ، قرآن کی الہامی حیثیت، ختم نبوت، ارشادات پیغمبر وقتی نہیں بلکہ دائمی ہیں، وحی کی حیثیت اساسی ہے۔ عقل وحی پر غالب نہیں، اس کے تابع ہے۔ عقل وحی کی دی ہوئی تعلیم کو ثابت کرنے کے لیے ہے نہ کہ وحی کو غلط بتانے کے لیے، شامل تھے۔

لبریشن تھیالوجی وغیرہ کے تصورات یہودیت اور عیسائیت کے پس منظر میں سامنے آئے اور استدلال کی بنیادوں کو تبدیل کیا گیا۔

جدید علم کلام کو درپیش چیلنج بنیادی طور پر مستشرقین کی طرف سے نہیں تھا، کیونکہ اصلاً ان کا استدلال بھی مذہبی ہی تھا۔ اصل چیلنج سائنسی تھا جس پر سیکولر تصورات کی عمارت کھڑی ہے اور یہی اسلام کو درپیش حقیقی چیلنج ہے۔ ڈاکٹر خالد علوی کا کہنا تھا کہ جدید علم کلام کے حوالے سے ہمارے لیے دو امور کی حیثیت بنیادی ہے:

☆ ہم نے اسلام کا دفاع کرنا ہے یا اس کے بنیادی حقائق پر سیکولر آئیڈیالوجی کی بنیاد پر مفاہمت کا رویہ اپنانا ہے؟

☆ دور حاضر میں جنہیں مسلمات مان لیا گیا ہے، ان کو قبول کرنا ہے یا چیلنج کرنا ہے؟ مثال کے طور پر جدید غالب سیکولر نظام فکر میں انسان کی آزادی کو بنیادی قدر تسلیم کیا گیا ہے۔ انسان خود اپنے معاملات کے بارے میں فیصلہ کرنے میں آزاد ہے اور کسی الہامی ہدایت کا پابند نہیں۔ اس کے بعد کیا وحی کی کوئی ضرورت اور افادیت باقی رہ گئی ہے؟ اس نظام فکر میں وحی ایک مابعد الطبیعاتی حقیقت ہے جسے تجرباتی علم سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے دنیاوی معاملات میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ بات جب آگے بڑھے گی تو لازماً نبوت کی حیثیت بھی معرض شک میں پڑے گی۔ نبی کا دیا ہوا پیراڈائم اور عقائد کیا سب ایک دور سے متعلق (Contextual) تھے؟ رسول اللہ نے اپنے دور میں اپنی حکمت سے بعض فیصلے کیے یا جسے وحی قرار دیا، اس کی بنیاد پر بعض امور طے کیے، آج کے متکلم کو طے کرنا ہے کہ وہ وقتی تھے یا آج بھی قابل عمل ہیں۔ ہم اس پر کیا مفاہمت اختیار کریں گے کہ پیغمبر محض اپنے عہد کے راہنما تھے۔ وہ اخلاقی اقدار کے اعتبار سے آج کے دور سے متعلق ہیں لیکن جہاں تک معاشی، سیاسی یا سماجی تنظیم کا معاملہ ہے تو وہ آج بالکل مختلف ہے۔

ڈاکٹر خالد علوی

تبدیلی کے اس عمل کی طرف ہمارا نظریہ اخلاق بھی ہماری توجہ لاتا ہے۔ یہ سوال اٹھتا ہے کہ مذہب کی دی ہوئی اخلاقی اقدار کیا اضافی ہیں؟ مثال کے طور پر حیا کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ نصف ایمان ہے۔ اس حیا کا پورا فریم ورک جسے ہمارے مسلمان معاشروں نے صدیوں سے اختیار کر رکھا ہے، کیا آج یہ اضافی ہے اور ہم اس پر مفاہمت قبول کر لیں گے؟ مثال کے طور پر اگر کسی کی بیٹی اپنے مرد دوست کے ساتھ گھر آتی ہے اور وہ رات ایک کمرے میں گزارنا چاہتے ہیں تو انسانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آزادی کی موجود قدر کی بنیاد پر کیا وہ مفاہمت کا رویہ اپنائے گا یا حیا کی قدر کو اولیت دے گا؟

ڈاکٹر خالد علوی نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ عقل انسانی جسے لادینی فکر میں حتمی حیثیت دی گئی ہے، کیا وہ حتمی ہے یا اضافی؟ عقل کلی یا جزوی، عقل انفرادی یا اجتماعی کو وحی پر کیا ترجیح حاصل ہے؟ جس پر محمد ﷺ گواہ ہیں اور جسے انہوں نے وحی کہا ہے۔ دور حاضر کے متکلم کے لیے یہ سوال بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر خالد علوی کا نتیجہ فکر یہ تھا کہ اگر ہم کو اسلام کا دفاع کرنا ہے تو پھر ہم ان مسلمات کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو ہمارے قدیم علم کلام کے پیراڈائم میں بیان ہوئے ہیں۔ اگر ہم نے مفاہمت کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر ہم نئے مسلمات پر بات کر سکتے ہیں۔ جدید علم کلام نئے مسلمات کو قبول کرنے کا نہیں بلکہ اپنے پیراڈائم کو جدید انداز میں بہتر طور پر پیش کرنے کا نام ہے، یہ بنیادی قدروں پر مفاہمت کا نام نہیں ہے۔

جاوید احمد صاحب غامدی نے موضوع زیر بحث پر اپنے خیالات کو تین نکات کی صورت میں بیان کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جدید علم کلام کی اصطلاح استعمال کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ قدیم علم کلام نے ہمیں کیا دیا؟ جاوید صاحب کا نتیجہ فکر تھا کہ اس علم کلام نے مذہب اور دین کو کچھ نہیں دیا۔ مثال کے طور پر قدیم دور میں جب ارسطو کی منطق کے بنیادی قواعد کو مسلمات سمجھتے ہوئے، ان کی بنیاد پر عقائد کی توضیح کی گئی تو عقائد در عقائد پیدا ہوئے جس پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں کہا کہ

ع یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات ومنات

گویا اس قدیم علم کلام سے لات ومنات کا ایک مجموعہ وجود میں آیا جس کی کوئی افادیت اس دور میں موجود تھی نہ آج موجود ہے۔ اس سے اس وقت بھی (دین کے مقدمات کو) نقصان پہنچا اور آج بھی پہنچے گا اگر ہم ان کو اختیار کرنے پر اصرار کریں گے۔ جدید علم کلام پر اگر کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ پہلے اس قدیم علم کلام کا بالخصوص فہم کلام کے حوالے سے جائزہ لے کیونکہ اس کے اثرات ہمارے پورے علم پر مرتب ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر فخر الدین رازی اشاعرہ کے متکلم ہیں لیکن وہ قرآن کو یہ حیثیت دیتے ہیں کہ الفاظ کی اپنے مفہوم پر دلالت ظنی ہے (یعنی الفاظ سے یقینی طور پر یہ نہیں جانا جا سکتا کہ متکلم کا منشا کیا ہے) یا یہ کہ عقلی برہانیات کے مقابلے میں قرآن کی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا .... کی آیت پر رازی کی تفسیر دیکھ لیں یا دور جدید میں دریدہ وغیرہ نے فہم کلام پر جو کام کیا ہے۔ اس پر ایک نظر ڈال لیں (اس سے معلوم ہو جائے گا کہ قدیم علم کلام نے ہمیں کیا دیا)۔ اسی طرح شاطبی نے الموافقات کا تیسرا مقدمہ یہ لکھا ہے کہ مذہب کی حقانیت کو اگر قطعیت تک لے جانا ہے تو ضروری ہے کہ سمعی دلائل کو ایک طرف رکھ دیں اور اجماع کو بنیاد بنا لیں۔

اس طرز فکر کا نتیجہ، جاوید صاحب کے نزدیک یہ نکلا کہ قرآن مجید جو خود کو برہان، فرقان، حکم اور قول فیصل کہتا ہے اور جس کا دعویٰ ہے کہ باطل اس کے دائیں سے داخل ہو سکتا ہے نہ بائیں سے، ایک کلیہ دینے کے بعد ہمیشہ کے لیے غیر متعلق ہو گیا۔ اس کا اصول فقہ پر یہ اثر پڑا کہ بجائے اس کے کہ وہ فطری طور پر کلام کو سمجھنے کا علم رہتا، وہ مسلمات کا علم بن گیا، جس کی روشنی میں علم کلام ایک مصنوعی چیز بن گئی۔ اللہ کے کلام میں ایک حکم بیان ہوا تو سیاق وسباق سے نوعیت حکم واضح ہو گی، لیکن یہ بات اصول فقہ میں طے ہونے لگی جو مکمل طور پر منطق کے زیر اثر مرتب ہوئے۔ اس ضمن میں آمدی اور غزالی وغیرہ کی تصنیفات کو دیکھنا چاہیے۔ مثال کے طور پر (امام) غزالی نے ''المنقذ من الضلال'' میں اپنا ذہنی سفر بیان کیا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ وہ اپنے اطمینان کے لیے کہاں کہاں گئے، لیکن کیا انہوں نے اس مقصد کے لیے قرآن مجید کی طرف بھی مراجعت کی، اس کا کوئی بیان نہیں۔ اسی طرح تفاسیر میں علم کلام کا ایک دور آیا۔ چنانچہ ان میں مفسر عقائد کی بحث کرتا ہے تو قرآن کے بجائے قائم شدہ مقدمات کی تفسیر کرتا ہے۔ (اسی وجہ سے) امام رازی کی تفسیر

جدید علم کلام کو درپیش چیلنج بنیادی طور پر مشنریز کی طرف سے نہیں تھا کیونکہ اصلاً ان کا استدلال بھی مذہبی ہی تھا۔ اصل چیلنج سائنسی تھا جس پر سیکولر تصورات کی عمارت کھڑی ہے۔

جاوید احمد غامدی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خورشید احمد ندیم

کے بارے میں یہ کہا گیا کہ اس میں سوائے تفسیر قرآن کے، سب کچھ موجود ہے۔

جاوید صاحب نے دوسرا نکتہ یہ بیان کیا کہ مذہب کی مدافعت کا خیال، مصالحت کی طرح ایک خطرناک تصور ہے۔ سچ یہ ہے کہ مذہب کو کسی مدافعت کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے (اپنے حق میں) استدلال بھی پیش کیا ہے۔ لیکن پورے علم کلام کو پڑھنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کے اپنے استدلال سے کسی نے اعتنا نہیں کیا بلکہ اس کی حقیقت منکشف ہی نہیں ہوسکی۔ یہ بات ہم قدیم علم کلام سے لے کر علامہ اقبال کے خطبات تک، تمام ذخیرہ علوم کو سامنے رکھ کر کہہ سکتے ہیں۔ اقبال نے جہاں جہاں قرآن مجید کی آیات سے استدلال کیا ہے، ان کو ہی اگر دیکھ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے۔ قرآن مجید محض حکم نہیں دیتا اس کا استدلال بھی دیتا ہے۔ وہ صرف عقائد بیان نہیں کرتا، ان کا استدلال بھی واضح کرتا ہے۔ قرآن کا اپنا استدلال ہمارے ہاں علم کلام کا کبھی موضوع نہیں رہا۔ دور جدید میں بھی یہی صورت حال ہے۔ ارسطو کی منطق کی طرح دور جدید نے بھی بعض مقدمات قائم کیے ہیں۔ ان کی بنیاد پر جدید علم کلام کھڑا ہے۔ گویا بنیادی نفسیات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

جاوید صاحب کی گفتگو میں تیسرا نکتہ یہ سامنے آیا کہ ہمیں قرآن کے اپنے ''علم کلام'' کو دریافت کرنا چاہیے۔ اپنے مقدمات اور مسلمات کو ایک طرف رکھتے ہوئے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ایمانیات، اخلاقی مقدمات اور شریعت کے بارے میں خود قرآن کیا استدلال بیان کرتا ہے۔ اگر ہم اسے دریافت کرلیں تو ہمیں مدافعت کی ضرورت ہے نہ مصالحت کی۔ صرف بیان واقعہ ہی حجت قائم کردے گا۔ قرآن کو اس لیے ہمیشہ کے لیے باقی رکھا گیا ہے۔ ورنہ جس طرح کی صورت حال ہے کہ عقائد علم کلام کے ماہرین اور شریعت اہل فقہ الگ کرلیتے۔ اسی طرح تعلق باللہ اہل تصوف کا میدان ہے تو پھر کتاب کی ضرورت باقی نہ تھی۔ اگر قرآن باقی ہے تو یہ بات تقاضا کرتی ہے کہ ہم اس کی بنیاد پر عقائد کا مطالعہ کریں۔ یہ صرف اخلاقیات کی فہرست ہی نہیں دیتا اس کا استدلال بھی بیان کرتا ہے۔ قرآن خود واضح کردیتا ہے کہ کون سا حکم وقتی تھا اور ابدی شریعت کیا ہے؟

جدید علم کلام کی روایت پر جاوید صاحب کا تبصرہ یہ تھا کہ اگر ہم سرسید، اقبال یا مصر میں محمد عبدہ وغیرہ کے کام کو دیکھیں تو ہمیں بنیادی نفسیات میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ بعض نتائج فکر نئے لگتے ہیں لیکن طریقہ استدلال وہی ہے۔ اسی طرح ہمیں جدید علم کلام کا اس زاویے سے بھی جائزہ لینا چاہیے کہ یہ کیسے آگے بڑھ رہا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے کام (قرآن اور علم جدید) اور مولانا وحیدالدین خان کی تصنیف (علم جدید کا چیلنج) ہے جیسے خیالات کا جائزہ لینا چاہیے کہ ان کوششوں کا حاصل کیا ہے؟ کیا قرآن کی یہ حیثیت تسلیم کی گئی ہے کہ وہ فرقان ہے؟ مسلمات سے مسلمات تک کے سفر کی حیثیت کیا ہے جو ایک دور میں مسلمات ہوتے اور دوسری میں نہیں ہوتے۔

قدیم علم کلام سے لات ومنات کا ایک مجموعہ وجود میں آیا جس کی کوئی افادیت اس دور میں موجود تھی نہ آج موجود ہے۔

جاوید صاحب کی رائے میں نئے درپیش مسائل میں اسلامی شریعت کا معاملہ سب سے نازک ہے۔ اخلاقیات کی حد تک تو مذہب کا کردار تسلیم کیا جاتا ہے لیکن کیا شریعت ابدی ہے۔ کیا تمام تر شریعت ایک وقتی قانون ہے، آج ان سوالات پر زیادہ غور کی ضرورت ہے۔ جاوید صاحب کا کہنا تھا کہ اس باب میں تین نقطہ ہائے نظر ہیں۔ ایک نقطہ نظر روایتی ہے، جو یہ کہتا ہے کہ شریعت کو قانون کے حوالے سے فقہا نے مرتب کردیا ہے، جس پر کسی کو اختلاف نہیں۔ اس رائے کے تحت اگر آزادیٔ رائے کو استعمال کیا جائے گا تو اس کا دائرہ بھی محدود ہوگا اور ہمیں چاروں ائمہ سے باہر نہیں جانا چاہیے۔ یہ نقطہ نظر شریعت اور فقہ کو ایک ساتھ رکھتا ہے۔ شاہ ولی اللہ اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے کام میں بھی یہی بنیادی فکر جاری وساری ہے۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ چونکہ تمدنی اور معاشرتی حالات تبدیل ہوتے رہتے ہیں اس لیے کوئی قانون ابدی نہیں ہوسکتا کیونکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

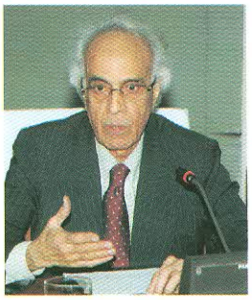

ڈاکٹر منظور احمد

قانون معاشرے کے لیے ہوتا ہے۔ یہ ایک ارتقا پزیر عمل ہے۔ اس اصول پر پرانی شریعتیں منسوخ ہوئی ہیں، لہٰذا آج کسی قانون اور شریعت کے مخصوص ڈھانچے پر اصرار صحیح نہیں۔ ہمارے ہاں یہ نقطہ نظر علامہ اقبال سے ہوتا ہوا اب ڈاکٹر منظور احمد صاحب تک جاری ہے۔ تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس کا فیصلہ قرآن مجید ہی کرے گا کہ اس کا کون سا حکم ابدی ہے اور کون سا وقتی۔ قرآن میں دونوں طرح کے احکام موجود ہیں اور قرآن ان کے دوام یا وقتی ہونے کے بارے میں ناطق ہے۔ یہ نقطہ نظر بھی اب مرتب ہو کر سامنے آچکا ہے۔ اس کی نمائندگی مولانا حمید الدین فراہی کرتے ہیں، پھر مولانا امین احسن اصلاحی سے ہوتا ہوا یہ نظام فکر آگے بڑھ رہا ہے۔

ڈاکٹر منظور احمد نے اپنی بات کا آغاز ''پیراڈائم شفٹ'' سے کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ خود بھی اس مسئلہ پر پوری طرح واضح نہیں اور یہ ان کے مسلسل سوچ بچار کا موضوع ہے۔ دوسری بات ڈاکٹر صاحب نے یہ کہا ہے کہ وہ اس بنیادی مقدمے سے متفق ہیں کہ علم کلام کوئی نئی بات نہیں۔ قرآن مجید نے بھی اس کا استعمال کیا کہ جب یہ سوال اٹھا کہ انسان دوبارہ کیسے جی اٹھے گا جب ہڈیاں خاک ہو جائیں گی۔ قرآن نے اپنے زمانے کے لحاظ سے اس کا جواب دیا۔ گویا علم کلام ایک طریقہ تفہیم ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآن مجید کی تفہیم میں ہم اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ اس کے مخاطبین کون تھے۔ دوسرا یہ کہ قرآن کوئی مرتب کتاب نہیں ہے۔ اس کا ایک خاص طرز تخاطب ہے اور اس کا اسلوب خطبے کا ہے۔

ڈاکٹر منظور احمد کا کہنا یہ تھا کہ نئے علم کلام کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ علم کی ترقی کے ساتھ علم کے معیارات بدلتے رہتے ہیں۔ کسی معاملہ کے صدق و کذب کا فیصلہ ہر دور کے علمی معیارات کے مطابق ہوتا ہے۔ اس حوالے سے پرانے دلائل کے ساتھ کام نہیں چلایا جاسکتا۔ ایک دور میں اس مقصد کے لیے ارسطو کی منطق استعمال کی گئی جو کوئی بری بات نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ایمان اور عقاید میں فرق ہوتا ہے۔ ایمان کے لیے کسی علم کلام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم کسی بات پر ایمان لاتے ہیں یا نہیں لاتے۔ اس میں صدق اور کذب کی بحث نہیں ہوتی۔ یہ مسائل ہونے یا نہ ہونے کے دائرے میں نہیں آتے۔ ایمان ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ لیکن جب ہم ایمانیات کو عقائد کی صورت میں مرتب کرتے ہیں تو پھر علم کلام کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر حضرت مسیح نے عقاید کا دفاع نہیں دیا، یہ بعد میں مرتب ہوا (جسے ہم مسیحی علم کلام کہتے ہیں) اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے بھی عقائد کا مرتب نظام نہیں دیا، یہ بھی بعد میں مرتب ہوا۔ اس طرح یہ بھی مسلمہ بات ہے کہ عقاید کے نظام میں اختلاف ہوگا۔ ایک عقیدے والا ایک علم کلام کا سہارا لے گا۔ اور دوسرا دوسرے علم کلام کا۔ اس ضمن میں ہم تاریخی بحثوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر منظور احمد نے اس رائے کا اظہار کیا کہ سیکولرزم یا جدیدیت لادینیت نہیں ہے۔ یہ بات اتنی سادہ نہیں جیسے اسے بالعموم بیان کیا جاتا ہے۔ ارسطو کی منطق کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ قضایاتی منطق ہے، جس کی بنیاد پر غلط اور صحیح کا حکم لگایا جاتا ہے۔ یہ منطق کی طرف ایک شکل کو تسلیم کرتی ہے البتہ اس کے نتائج مختلف ہو سکتے ہیں۔ اس کے تحت بہت سی باتوں کو مسلمات کی صورت میں ڈھالا جاتا ہے اور پھر دلائل دیے جاتے ہیں۔ ہم جب اسے مذہبی حوالے سے بیان کرتے ہیں تو شرعی دلائل دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن مجید ہدایت کی کتاب ہے۔ ہم اسے منطق میں ڈھالتے ہیں، ایک صغریٰ کبریٰ ترتیب دیتے ہیں اور پھر نتائج مرتب کرتے ہیں۔ ہم اسے ہی نتائج حاصل کرنے کا واحد طریقہ سمجھتے ہیں۔

کلام الٰہی کو سمجھنے کے لیے بھی تفہیم کے نئے طریقوں سے مدد لی جاسکتی ہے۔ اس سے ہم جان سکتے ہیں کہ قرآن میں بیان کیے گئے سماجی احکام ابدی ہیں یا وقتی یا یہ کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔

ڈاکٹر منظور احمد کا کہنا تھا کہ وہ جب پیراڈائم کی تبدیلی کی بات کرتے ہیں تو اس کا مقصد انداز فکر پر نظر ثانی کی ضرورت کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نمایاں کرنا ہے۔ بیسویں صدی کے آخر تک تفہیم کے انداز میں تبدیلیاں واقع ہوگئی ہیں۔ لوگ اس بات کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ ہم جو جملے ادا کرتے ہیں وہ منطقی ساخت کے اعتبار سے ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے اور تفہیم کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ انہیں کسی ایک ہی ساخت میں ڈھالا جائے۔ ہم جو جملے بولتے ہیں۔ ان کے صدق وکذب کے معیارات مختلف ہوسکتے ہیں۔ مثلاً دو جمع دو چار ہوتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ ہے لیکن Empirical نہیں ہے لیکن مغرب اسے مسلمہ مانتا ہے۔ مغرب آئن سٹائن کو مانتا ہے، ریاضیاتی اصولوں کو تسلیم کرتا ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ جب کوئی جملہ ادا کیا جاتا ہے تو اس کے کئی مقاصد ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب قرآن یہ کہتا ہے کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے تو اس سے مقصد کوئی علمی قضیہ بیان کرنا نہیں ہے یعنی یہ اس جملے کا حاصل منشا نہیں ہے بلکہ اس کو بنیاد بنا کر کسی دوسری بات پر استدلال کرنا ہے۔ اس طرح بعض جملے اخلاقی اقدار کو بیان کرتے ہیں جو Empirical نہیں ہوتے۔ یعنی حواس سے حاصل شدہ علم پر مبنی نہیں ہوتے۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ یہ ایک نیا طریقہ ہے جو کسی کلام کو سمجھنے کے لیے ایک نئی کھڑکی کھول سکتا ہے۔ پیراڈائم کی تبدیلی سے ان کی مراد یہ ہے کہ کلام الٰہی کو سمجھنے کے لیے بھی تفہیم کے نئے طریقوں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ اس سے ہم جان سکتے ہیں کہ قرآن میں بیان کیے گئے سماجی احکام ابدی ہیں یا وقتی یا یہ کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ اسی طرح مابعد الطبیعاتی مسائل کے فہم میں بھی اس طریقے سے مدد لی جاسکتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ کلام کی نوعیت کیا ہے۔

سرسید احمد خان کے بارے میں ڈاکٹر منظور صاحب کا خیال تھا کہ وہ یونانی منطق کے طے کردہ قانون قضا سے نہیں نکل سکے۔ ان کے ہاں ملائکہ وغیرہ کے مسئلے پر جو تضاد ہے اسے دور کرنا ضروری ہے (یعنی انہیں فرشتوں وغیرہ کے مسئلہ پر کسی سائنسی توجیہ کی ضرورت نہیں تھی)۔ کلام کے فہم میں ایک مسئلہ تناظر (Context) کا بھی تھا جسے سامنے رکھنا چاہیے تھا۔ علامہ اقبال کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کی رائے تھی کہ انہوں نے ابتدا میں ایک بڑی اہم بات کہی کہ انسان کا مذہبی وجدان تخلیقی ہے۔ اس سے بات کو آگے بڑھانے میں بہت مدد مل سکتی ہے، اگر قانون سازی میں اس کو مبدا مان لیا جائے۔ مسلمانوں کا حقیقی تجربہ قانون کے میدان میں ہے۔ بعد میں اقبال نے بھی وہی قانون کے چار ماخذ (قرآن، سنت، اجماع، قیاس) کی بات کہنا شروع کر دی۔ حالانکہ وہ اس سے پہلے ایک بڑی اور بنیادی بات کہہ چکے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ سیاسی حالات کے باعث ان کی توجہ دوسری باتوں کی طرف ہوگئی اور اس کا نتیجہ اس رجعت میں صورت میں نکلا۔ جب ہم ماخذ قرآن کی بات کرتے ہیں تو ساتھ ہی تحدید کر دیتے ہیں یعنی ہم کسی دوسری طرف نہیں جاسکتے۔

ڈاکٹر منظور صاحب نے پیراڈائم شفٹ کی بات کو سمیٹتے ہوئے کہا کہ وہ اس موضوع پر کوئی حتمی بات نہیں کہہ رہے کیونکہ ان کی سوچ بچار کا عمل جاری ہے۔ اس ضمن میں ان کا کہنا یہ تھا کہ ہمیں الہامی کتابوں کو سمجھنے کی شرائط واضح کرنی چاہئیں۔ اگر ایک دفعہ یہ اصول واضح ہوجائیں کہ قرآن کو کیسے سمجھنا ہے تو پھر تفہیم میں آسانی پیدا ہوجائے گی۔

ڈاکٹر منظور احمد اس مذاکرے کے آخری مقرر تھے۔ اس کے بعد سوال وجواب کا آغاز ہوا جن سے موضوع کی مزید وضاحت ہوئی اور بعض نئے پہلو سامنے آئے۔ شرکا نے اس مجلس کو بہت مفید قرار دیا اور اس رائے کا اظہار کیا گیا کہ اگر مسلمان معاشروں کو درپیش مسائل پر آزادانہ غور وفکر کی روایت آگے بڑھے تو ہم اپنے مسائل بہتر طور پر حل کرسکیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ فکری ابہام بھی دور ہوجائے گا، مسلمان معاشرے جس کا دور جدید میں شکار ہیں۔

© rasailojaraid.com